ترقی پسند تحریک اور فیض کی شاعری میں روایت کا رنگ

صبا عنبرین

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

انیسویں صدی انقلاب کی صدی رہی ہے۔ پھر بات چاہے ہندوستان کی ہو یا عالمی سطح کی ہر طرف ہلچل مچی ہوئی تھی۔ کارل مارکس کے نظریات سے متاثر ۱۹۱۷ء کا روس کا انقلاب ایک ایسا انقلاب تھا جس نے تمام دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام اور سامراجی طاقتوں کے خلاف نفرت کے جذبے کو ہوا دی۔ ہندوستان میں بھی سیاسی وسماجی سطح پر اہم تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ یہ ایک بحرانی دور تھا جس نے تمام دنیا کو تہہ وبالا کیا ہوا تھا۔ عالمی سطح پر دوسری عالمی جنگ روس کا انقلاب، ہندوستان میں جنگِ آزادی کا بڑھتا ہوا زور، بنگال کا قحط ایسے حالات تھے جو توجہ چاہتے تھے۔

زندگی میں ترقی اور تبدیلی کی خواہش نظر آ رہی تھی، لیکن دم توڑتے ہوئے جاگیردارانہ نظام کی گرفت ابھی بھی سماجی زندگی پر تھی تو دوسری طرف عوام غدر کے خوفناک اور تباہ کن اثرات سے خوفزدہ تھے ایسے میں علی گڑھ تحریک نے زندگی اور ادب دونوں میں ایسے عناصر اور کردار تخلیق کیے جو اس وقت زندگی کو بیان کرتے تھے، لیکن ان کی تعداد محدود تھی پھر بھی اتنا ہوا تھا کہ جمود ٹوٹنے لگا تھا اس کے باوجود بھی جاگیردارانہ نظام کی سوچ موجود تھی جس نے مذہب کو جمود اور بے عملی کی علامت بنا دیا تھا۔ لوگوں کو بے روح قناعت اور بے جان تقدیر پرستی کا اسیر بنا دیا تھا تاکہ وہ اطاعت وعبادت میں لگے رہیں اس ماحول کے خلاف ایک خلش، گھٹن، محرومی، جذبۂ انتقام بے دست وپا زندگی سے رہائی حاصل کرنے کا جذبہ لوگوں کے تحت الشعور میں تھا اس تحریک نے وقت کے تیور کو پہچانا اور زیرِ سطح اس بے چینی کو محسوس کیا۔ زندگی اور ادب کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ بے زبانوں کو زبان دی۔

ادب اور زندگی کے وہ رشتے جو پہلے سے موجود تھے ان کی نئی تشکیل کی اس کے ساتھ ہی زندگی کے معاشی اور مادی پہلوؤں کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے پسماندہ عوام، مزدوروں، کسانوں اور دوسرے محنت کشوں کو اجتماعی جدوجہد کا راستہ دکھایا۔ ادب اور زندگی کا رشتہ سیاست اور قیادت سے براہِ راست استوار کیا۔ ترقی پسند ادب کے مقاصد وعزائم کو سجاد ظہیر کے ان الفاظ میں سمجھا جا سکتا ہے:

''ہم اپنے وطن میں ایسی تہذیب اور ایسے ادب کے نمو اور فروغ کے خواہاں تھے جو ہمارے وسیع ملک میں رہنے والی مختلف اقوام اور تہذیبی گروہوں کے آزادی خواہ، روشن، سائنسی اور عقلی رجحانات کو نمایاں کرے۔ ہم قدیم جاگیردارانہ قوم پرستی اور مذہبی منافرت کے زہریلے اثرات کو ختم کرنا چاہتے تھے، ہم اپنے ماضی کی عظیم ترین تہذیب سے اس کی انسان دوستی، حق پرستی، صلح جوئی، اس کا حسن اور سبھاؤ اخذ کر لینے کے خواہشمند تھے، لیکن اس کے جمود، عقل دشمنی اور افیون صفت جھوٹی روحانیت کو سختی سے مسترد کرتے تھے۔ ہمیں ماضی سے بیش بہا ذخیرہ ورثے میں ملا ہے اس میں ہم نے اپنی استعداد اور ضرورت کے مطابق آمیزش کی ہے دوسرے ملکوں اور تجربے کا پیہم مطالبہ ناگزیر ہے کہ تہذیب، علم اور اخلاق کی سچی اقدار جو ہماری قدیم اور عظیم قوم سے ورثے میں ملی ہیں ہماری نئی تہذیب کی تعمیر کے عمل میں پیوست اور جذب ہوں۔''

ادب اور زندگی کو سمجھنے کے لیے سائنٹفک نقطۂ نظر پر زور دیا۔ ادب میں سماجی شعور کو اہم بتاتے ہوئے ادیبوں کو عوامی زندگی سے قریب اور قومی وسماجی مسائل اور پریشانیوں سے جوڑا انھیں درباروں، خانقاہوں، محلوں سے نکال کر کھیتوں اور کارخانوں سے روشناس کیا۔ زندگی کی اس سچائی کو پریم چند نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا۔ ہمارا آرٹسٹ امرا کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا۔ انھیں کی قدردانی پر اس کی ہستی قائم تھی اور انھیں کی خوشیوں اور رنجوں، حسرتوں اور تمناؤں، چشمکوں اور رقابتوں کی تشریح وتفسیر آرٹ کا مقصد تھا۔ اس کی نگاہیں محل سراؤں اور بنگلوں کی طرف اٹھتی تھیں۔ جھونپڑے اور کھنڈر اس کے التفات کے قابل نہ تھے انھیں وہ انسانیت کے دامن سے خارج سمجھتا تھا۔ آرٹ نام تھا محدود صورت پرستی کا، الفاظ کی ترکیبوں

کا، خیالات کی بندشوں کا، زندگی کا کوئی اونچا مقصد نہیں۔

ہمارا آرٹ شبابیات کا شیدائی ہے اور نہیں کہ شباب سینے پر ہاتھ رکھ کر شعر پڑھنے اور صنف نازک کی کج ادائیوں کے شکوے کرنے یا اس کی خود پسندیوں اور چونچلوں پر سر دھننے میں نہیں ہے۔ شباب نام ہے آئیڈیل کا، ہمت کا، مشکل پسندی کا، قربانی کا۔''

یہ کیفیت تب پیدا ہوگی جب ادیب کے سامنے ایک نقطۂ نظر ہو اور وہ اپنے زمانے کے مسائل کو سمجھ سکے:

''یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوگی جب ہماری نگاہ حسن عالمگیر ہو جائے گی جب ساری خلقت اس کے دائرے میں آجائے گی۔ وہ کسی خاص طبقہ تک محدود نہ ہوگا۔ اس کی پرواز کے لیے محض باغ کی چار دیواری نہ ہوگی بلکہ وہ فضا جو سارے عالم کو گھیرے ہوئے ہو۔ تب ہم بدمذاقی کے متحمل نہ ہوں گے۔ تب ہم اس کی جڑ کھودنے کے لیے سینہ سپر ہو جائیں گے۔ تب ہم اس معاشرت کو برداشت نہ کرسکیں گے کہ ہزاروں انسان ایک جابر کی غلامی کریں۔ تب ہماری خودداری انسانیت اس سرمایہ داری کے خلاف علم بغاوت بلند کرے گی۔ تبھی ہم صرف صفحۂ کاغذ پر تخلیق کر کے خاموش نہ ہو جائیں گے بلکہ اس نظام کی تخلیق کریں گے جو حسن اور مذاق، خودداری اور انسانیت کا منافی نہیں ہے۔ ادیب کا مشن نشاط اور محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے۔ اس کا مرتبہ اتنا نہ گرائیے۔ وہ وطنیت اور سیاسیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں ہے بلکہ ان کے آگے مشعلِ راہ دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے''۔

ایسے حالات میں جب زندگی کے ہر شعبہ میں تغیر و تبدیلی کے آثار نظر آنے لگے تھے ایسے ادب کی ضرورت تھی جو عوام کے نچلے طبقے کی ترجمانی کر سکے جن کے ساتھ برسوں ناانصافی کی گئی ہے ان کا استحصال کیا گیا ان کے حق کے لیے آواز بلند کر سکے زندگی کی سچائیوں کو بیان کر سکے اصولوں اور ضابطوں کی وہ اجارہ داری جو ادب کو زندگی سے دور کرتی ہے ادب اور زندگی کے حقائق کی ترجمانی کے درمیان حائل ہوں انھیں رد کیا جائے اور ان کی جگہ نئے اصول وضع کیے جائیں جو بدلتے وقت اور حالات کی روشنی میں ادب کی مقصدیت اور اس کے اہمیت کو واضح کر سکیں۔ بدلتے وقت کے ساتھ اپنی سوچ وفکر کو بدلنا بیدار ذہن کی علامت ہے اور رد وقبول کے اس سلسلے کا قائم ہونا اس وقت کی اہم ضرورت بھی تھا۔ ایسے حالات میں جب ترقی پسند تحریک کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت ادیبوں، شعرا نے ان کی پذیرائی کی۔ ۱۹۳۵ء میں لندن میں ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں نے اپنی تحریک کا جو پہلا مینی فیسٹو تیار کیا تھا اس پر ڈاکٹر ملک راج آنند، سجاد ظہیر، جیوتی گھوش، ایس کے بھٹ، ایس سنہا کے دستخط شامل تھے۔ اس مینی فیسٹو میں جن حقائق کو شامل کیا گیا وہ کچھ اس طرح ہیں:

''ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ زندگی میں ہونے والے تغیرات کو الفاظ کا لباس دیں۔ ادب کو انحطاط اور قدامت پرستی کی اجارہ داری سے نکال کر عوام سے قریب کیا جائے، اسے زندگی اور واقعیت کا آئینہ دار بنایا جائے۔ نئے ادب کو موجودہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا چاہیے اور وہ ہے ہماری روٹی کا، بدحالی کا، ہماری سماجی پستی کا اور سیاسی غلامی کا سوال۔ ہم اسی وقت ان مسائل کو سمجھ سکیں گے اور ہم میں انقلابی روح بیدار ہوگی۔ وہ سب کچھ جو ہم کو انتشار، نفاق اور اندھی تقلید کی طرف لے جاتا ہے قدامت پسندی ہے اور وہ سب کچھ جو ہم میں تنقیدی صلاحیت پیدا کرتا ہے جو ہمیں اپنی عزیز روایات کو بھی عقل وادراک کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے اکساتا ہے، جو ہمیں صحتمند بناتا ہے اور ہم میں اتحاد اور یکجہتی کی قوت پیدا کرتا ہے اسی کو ہم ترقی پسند کہتے ہیں''۔

جاگیردارانہ عہد کا وہ ادب جو تسکینِ قلب کے لیے تخلیق کیا جاتا تھا اور ایک مخصوص طبقے کی نمائندگی کرتا تھا اور جس میں مزدوروں، کسانوں اور محنت کش طبقے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی، ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر ناقابلِ قبول سمجھا جانے لگا ترقی پسند تحریک کے پہلے خطبۂ صدارت میں منشی پریم چند نے ادب کو زندگی کا ترجمان بنا کر پیش کرنے پر زور دیا۔ ایسے ادب کی تخلیق پر زور دیا جو خواص کے بجائے عوام کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ خطبہ ترقی پسندوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا۔

ترقی پسند تحریک کا پہلا اعلان نامہ اردو ادب میں ایک موڑ کی حیثیت رکھتا ہے جس میں انجمن کے مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے بنیادی مسائل، عدم مساوات، پسماندہ طبقے کی مشکلات، بھوک اور بیکاری وغیرہ کو ادب کا موضوع بنایا گیا۔ توہم پرستی، بے بسی، ماضی کی فرسودہ روایات سے چمٹے رہنے کی، اس اعلان میں سختی سے مخالفت کی گئی۔

ترقی پسند نظریات کے زیرِ اثر جو شاعری کی گئی وہ کافی حد تک وضاحتی رہی اپنی بات کو اشارے کنائے میں کہنے کے بجائے صاف و سادہ زبان و لہجے میں بیان کرنے کا طریقہ اپنایا گیا یہی وہ فکر تھی جس نے ہیئت اور مواد کی نہ ختم ہونے والی بحث چھیڑ دی۔ خود ترقی پسندوں میں اسے لے کر مختلف باتیں ہوتی رہی ہیں کچھ نے شاعری میں مواد کو اہمیت

دی ہے تو کچھ نے ہیئت کو ترجیح دی ہے۔ سجاد ظہیر کے الفاظ میں:

''شاعر کا پہلا کام شاعری کرنا ہے وعظ دینا نہیں۔ اشتراکیت انقلاب کے اصول سمجھانا نہیں۔ اصول سمجھنے کے لیے کتابیں موجود ہیں اس کے لیے ہم کو نظمیں نہیں چاہئیں۔ شاعر کا تعلق جذبات کی دنیا سے ہے۔ اگر وہ اپنے تمام رنگ و بو، تمام ترنم و موسیقی کو کام میں نہیں لائے گا۔ اگر فن کے اعتبار سے اس میں بھونڈا پن ہوگا، اگر وہ ہمارے احساسات کو لطافت کے ساتھ بیدار کرنے میں قاصر رہے گا تو اچھے سے اچھے خیال کا وہی حشر ہوگا جو بنجر زمین میں دانے کا ہوتا ہے''۔

تو دوسری طرف سردار جعفری ہیئت پر زور دیتے ہیں۔ کہتے ہیں:

''جب ہمارے اردو ادب نے چولا بدلا تو حالی اور اقبال پر اسی طرح پھبتیاں کسی گئیں اور آج ترقی پسند شاعری پر حملہ کیا جا رہا ہے وہ چلائیں گے، لیکن روح کہاں ہے؟ یہ تو محض خطابت ہے شاعری ہے کہاں؟ یہ تو صرف صحافت ہے۔ سرمایہ داری بڑا بھدا لفظ ہے۔ بلبل کتنا حسین لفظ ہے''۔

اس وضاحتی بیان کا منفی نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری میں خطیبانہ اور کھردرا انداز شامل ہو گیا جس نے شعریت کو مجروح کیا اور مقصدیت حاوی نظر آئی۔ سب سے بڑی ضرب غزل پر پڑی کیونکہ اشاریت و ایمائیت غزل کا امتیازی وصف ہے اس لیے ترقی پسندوں نے اسے کافی حد تک نظر انداز کیا۔ جذبے کا فقدان، وضاحتی انداز کے ہونے نے شاعری کو ہنگامی حالات کا آئینہ بنا دیا۔ بہت حد تک مقصدیت کا رجحان حاوی نظر آیا۔ بہت حد تک خطیبانہ شاعری کا انداز ملتا ہے۔

ترقی پسند شاعروں میں فیض کو معتبر مقام حاصل ہے۔ انھیں اپنے ہم عصروں میں نمایاں حیثیت ملی ہے جب ترقی پسندوں نے غزل کو رجعت پسند شاعری قرار دیا اور اپنے مقصد کے لیے نظم کو غزل پر فوقیت دی۔ چونکہ ترقی پسندوں کا ادبی نقطۂ نظر مقصدی و افادی تھا اس لیے انھوں نے اسے چنا:

''ترقی پسندوں کا مسلک بھی غزل کی غزلیت سے زیادہ بیانیہ نظموں کی وضاحت اور خطابت کا طالب تھا اس لیے انھوں نے غزل سے کہیں زیادہ نظموں پر توجہ دی''۔

یوں تو ترقی پسند تحریک کے منشور کے مطابق براہِ راست اندازِ بیان اور علامت نگاری متضاد تھے پھر بھی چند ترقی پسند شعرا نے غزل کو اپنے احساسات و خیالات کا ترجمان بناتے ہوئے اس کی کلاسیکی انفرادیت کو قائم رکھا خصوصاً فیض کی شاعری میں غزل کو اس کی غنائیت کے ساتھ برتا گیا ہے۔ فیض وہ شاعر ہے جو دلوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ بے نام جذبوں اور گونگے احساسات کو زبان دینے کے ساتھ انھیں نیا شعور اور نئی آگہی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی عوام کا جذبۂ کرب بھی شامل ہوتا ہے اور ان کی قوت بھی اس میں ہے کہ یہاں دلوں کا گداز بھی ہے، دکھی انسانیت کا نوحہ بھی ہے۔ فیض کے یہاں محض نعرہ بازی نہیں ہے، عارضی سیاست بازی بھی نہیں ہے دائمی سیاست ہے۔ گہرے تجربات و احساسات ہیں۔ انھوں نے رومان کو حقیقت سے ملانے کا کام کیا ہے۔ ان کی ظاہری دنیا رومان ہے اور باطنی دنیا حقیقت ہے۔ ان کے یہاں حسن و عشق کی وارداتیں ہیں تو زیر دستوں اور کمزوروں سے ہمدردی بھی ہے، ان کی زبان اتنی سادہ دل کش اور دلنشیں ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ہی مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ فیض کی شاعری کا اپنا مخصوص آہنگ اور اپنا مخصوص لب و لہجہ تھا۔ اس لہجے میں اردو شاعری کی روایت کا حسین ماضی اور حال کے زمانے کا شعور شامل تھا۔ فیض نے روایتِ ماضی کو حال میں جذب کر کے اسے مستقبل سے ملانے کا کام کیا ہے۔ زمانے کے حالات کی لے میں دلوں کی دھڑکن کو محسوس کرنے کا جو کام فیض نے کیا ہے اسی سے ان کی شاعری کا خوبصورت امتزاج سامنے آتا ہے۔ انھوں نے شاعری کو حقیقت نگاری سے مزین کر کے اس کی راہوں کو مقصدیت ہمکنار کیا۔ فیض کی شاعری جذبے اور فکر، داخلیت و خارجیت کے امتزاج اور توازن کی حیرت انگیز مثال ہے۔ جسے ان کے دھیمے اور نرم لہجے نے جلا دے کر سحر انگیز بنا دیا ہے۔ اس حوالے سے عبدالغنی نے کہا ہے:

''فیض کے کلام میں رومانیت اور انقلاب، محبت اور بغاوت کے دو دھارے ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ملے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے بالکل الگ کر کے دیکھنا گویا قوسِ قزح کے رنگوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہوگا۔''

اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہاتھ

فیض جبر و استحصال کے خلاف تھے عدل و انصاف حامی ہونے کے ساتھ ہی وہ عوام کو انسانی قوتوں کا سرچشمہ سمجھتے تھے۔ وہ عوام جو کھیت و کھلیان کو ہرا بھرا بنا دیتے ہیں، جن کے دم سے صنعت و حرفت ترقی کرتی ہے۔ ان کی شاعری میں عوام کی اسی حقیقی قوت کو بیان کیا گیا ہے جس کے شعور کی روشنی میں قومیں فلاح کا راستہ پاتی ہیں۔ یہی روشنی عوام کے دلوں میں بھی جگانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے دکھی انسانیت کو منزل کا راستہ دکھانے کی کوشش سود و زیاں کا احساس کیے بغیر کی ہے۔ یہ بات فیض اس

طرح کہتے ہیں:

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن وصوتِ ہزار کا موسم

وہ شاعر یا ادیب جو اپنی روایات کی پاسداری نہیں کرتے اس سے کٹ جاتے ہیں وہ اپنی تاریخ کے تخلیقی سوتوں سے کٹ کر بے جان اور بے اثر ہو جاتے ہیں یہ تو فطرت کا تقاضا بھی ہے کہ جو پیڑ اپنی جڑوں کو چھوڑ دیتا ہے وہ ہوا کے تیز جھونکوں کو جھیل نہیں پاتا اور گر جاتا ہے۔ یہ ہی معاملہ ادب کے ساتھ بھی ہے کہ شاعر یا ادیب اپنے ماضی کی مفید اور مثبت روایتوں سے اپنا تعلق استوار کرے اور فیض نے اپنی شاعری میں روایت کے مثبت پہلو کو برقرار رکھا ہے۔ فیض کی شاعری غمِ جاناں سے شروع ہو کر غمِ دوراں سے جا ملتی ہے۔ فیض کی شاعری میں جہاں وہ اپنی شاعری کی ابتدا کرتے ہیں اور غمِ جاناں کی بات کرتے ہیں انھوں نے شدید محبت کی، لیکن انھیں ناکامی ملی۔ وہاں محبت میں ناکام دل کی تمام کیفیات وجذبات کا بیان ملتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا جدید نظم کی کروٹیں میں لکھتے ہیں:

''شاید اردو نظم کے کسی شاعر نے محبت کے جذبے کو اتنی شدت اور خلوص کے ساتھ پیش نہیں کیا جتنی شدت اور خلوص سے فیض نے پیش کیا ہے۔''

جہاں فیض عشق و رومان کی بات کرتے ہیں وہاں رنگِ حسرت نظر آتا ہے۔ حسرت کہتے ہیں:

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام
اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

یہاں فیض کہتے ہیں:

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمھارے بام پر آنے کا نام
دوستو، اس چشم ولب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے، نہ مے خانے کا نام

فیض کہتے ہیں:

رازِ الفت چھپا کے دیکھ لیا
دل بہت کچھ جلا کے دیکھ لیا
آج ان کی نظر میں کچھ ہم نے
سب کی نظریں بچا کے دیکھ لیا

وعدہ وفا بھی نہیں وعدہ دگر بھی نہیں
وہ مجھ سے روٹھے تو تھے لیکن اس قدر بھی نہیں
دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

جب فیض ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے تو انھوں نے اس غمِ جاناں میں غمِ دوراں کو بھی شامل کیا۔ یہاں انھوں نے زندگی کے تجربات میں قلبی گداز کو شامل کیا، مادی حقائق اور تخیل کے حسین امتزج سے زندگی کی سچائیوں کو سازِ دل سے ملا کر نغمگی پیدا کی ہے۔ مسلسل مشکل حالات کا سامنا کرنے کے باوجود بھی وہ مایوس نہیں ہوتے۔ قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے شعور کو نکھارا۔ وطن کی پکار، غریبوں کی آہیں، مظلوموں کی تڑپ، شامل ہیں وہ تو قفس کے اندھیروں میں بھی روشنی تلاش کر لیتے ہیں۔ سحر، چاند، ستارے، گل وبلبل، زلف، رخسار، لب وعارض جیسے روایتی الفاظ کو ان کے محدود معنوں سے نکال کر سیاسی اقتصادی اور تہذیبی وسماجی تناظر میں استعمال کیا ہے:

چھلک رہی ہے تیرے حسنِ مہرباں کی شراب
بھرا ہوا ہے لبا لب ہر اک نگاہ کا جام
ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں ہر روز صبحِ نسیمِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے اشکوں سے منور جاتی ہے
ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھی تیری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے عتاب جرمِ سخن سے پہلے

وہ جابر حکمرانوں پر طنز بھی کرتے ہیں تو بہت خوبصورتی کے ساتھ۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

یہاں وہ غالب کی تقلید کرتے نظر آتے ہیں۔ غالب نے کہا تھا:

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خون چکا
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

فیض کہتے ہیں:

متاعِ لوح وقلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر یک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

فیض نے اپنی شاعری میں روایت کی تخلیقی قوت کو برقرار رکھا ہے اور اسے ایک نیا منظر نامہ عطا کیا ہے۔ ○○